باب 5

لکھنؤ میں اُردو شاعری

13085CH05

1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی۔ بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار کی وجہ سے یہاں کی معاشی صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔ مجبوراً یہاں کے شعرا، ادبا اور دوسرے اربابِ فضل وکمال مختلف پناہ گاہیں ڈھونڈھنے لگے۔ اس زمانے میں دہلی کے برخلاف اودھ میں خوش حالی تھی۔ یہاں کے صوبےدار برہان الملک سعادت علی خاں تھے، جنھوں نے فیض آباد کو دارالسلطنت بنا کر بڑی حد تک خودمختاری حاصل کرلی تھی۔ ان کے بعد صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے یہاں کی حکومت سنبھالی۔ انھوں نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ان کی سخاوت کا ہر طرف شہرہ تھا اس لیے دوسرے اربابِ کمال کے ساتھ اردو کے شعرا بھی پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں جمع ہوتے گئے۔ اس طرح لکھنؤ شعروادب کا ایک مرکز بن گیا۔ آصف الدولہ کے بعد غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر اور آخر میں واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔

فیض آباد اور پھر لکھنو میں شعروسخن کی بساط جمانے والوں میں وہ شعرا پیش پیش تھے جو دہلی اور اس کے اطراف سے ہجرت کرکے وہاں پہنچے تھے جیسے سوؔدا، میرتقی میرؔ، میرحسنؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ، انشاؔ وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی نسل ان شعرا کی تھی جو یہیں پلے بڑھے اور استادی کے درجے تک پہنچے۔ ان میں ناسخؔ اور آتشؔ سرفہرست ہیں۔ ان کے بعد ناسخؔ کے شاگردوں میں وزیرؔ، رشکؔ، بحرؔ وغیرہ اور آتشؔ کے شاگردوں میں نسیمؔ، صباؔ، رندؔ، شوقؔ وغیرہ نے لکھنؤ کی شعری روایت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

لکھنوی شعرا نے صنف مرثیہ کی طرف بھی توجہ کی اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ مرثیہ گو شعرا میں خلیقؔ و ضمیرؔ اور انیسؔ و دبیرؔ نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ بعد میں اوجؔ، مونسؔ، انسؔ، عشقؔ، وحیدؔ وغیرہ نے مرثیہ گوئی کی اس روایت کو جاری رکھا۔ 'ریختی' کی بنیاد بھی لکھنؤ ہی میں پڑی۔ انشاؔ، رنگینؔ، جانؔ صاحب نے اس میں شہرت پائی۔ 'واسوخت' میں بھی یہاں نئی نئی راہیں نکالی گئیں۔ امانتؔ کا نام اس باب میں سرِفہرست ہے۔ لکھنؤ میں شعروادب کے مطالعے کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے :

پہلا دور

لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور دہلی کے طرز پر ہی شروع ہوا جس میں سادگی اور صداقت پسندی کو اہمیت حاصل تھی۔ تاہم رفتہ رفتہ لکھنؤ کی شاعری نے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ زبان و بیان اور لب و لہجے میں تبدیلی کے علاوہ افکار و تصورات میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آہستہ آہستہ رنگینی، تکلف اور تصنع کو اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ پہلے دور سے تعلق رکھنے والے شعرا میں مصحفیؔ، جرأتؔ، انشا، رنگینؔ اور شاہ نصیرؔ کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جو دہلی سے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ پہنچے تھے۔

مصحفیؔ (1747/50-1824/25) : ان کا نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اصلاً امروہہ کے رہنے والے تھے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ آنولہ، ٹانڈہ (بریلی)، دہلی وغیرہ میں مقیم رہنے کے بعد بالآخر لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ سلیمان شکوہ کے دربار سے انشاء اللہ خاں انشا کی وابستگی کے بعد انشا اور مصحفی میں ٹھن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو کم تر ثابت کرنے پر تُل گئے۔

مصحفی نہایت پُرگو شاعر تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے آٹھ دواوین کے علاوہ ایک دیوانِ قصائد اور متعدد مثنویاں ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ ان کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ شامل ہیں۔ انھوں نے فارسی میں بھی تین دیوان مرتب کیے اور شعرائے فارسی و اردو کے تین تذکرے بھی لکھے۔ خلیقؔ، آتشؔ، اسیرؔ وغیرہ ان کے قابلِ ذکر شاگرد ہیں۔ مصحفیؔ کے یہاں ہر رنگ کے شعر مل جاتے ہیں۔

چلی بھی جا جرَسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم	کہیں تو قافلۂ نَو بہار ٹھہرے گا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا	کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا	ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم	تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

جرأتؔ (1748/49-1809/10) : ان کا نام شیخ یحییٰ امان قلندر بخش تھا۔ ان کے آبا و اجداد مغلیہ دربار سے وابستہ تھے۔ دہلی کے حالات خراب ہوئے تو جرأت ترکِ وطن کر کے پہلے فیض آباد، پھر لکھنؤ پہنچے۔ اُن دِنوں لکھنؤ میں مرزا

سلیمان شکوہ شعرا کی سرپرستی کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ جرأت بھی سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔

جرأت کے بارے میں مشہور ہے کہ عین جوانی میں نابینا ہو گئے تھے۔ اُن کی تعلیم تو معمولی تھی لیکن زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ علمِ نجوم اور فنِ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے۔ زندہ دل تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندہ دلی کی مظہر ہے۔ معاملاتِ عشق کے بیان میں وہ نہایت بے باک تھے۔ اپنے استاد جعفر علی خاں حسرؔت دہلوی کی طرح انھوں نے بھی معاملہ بندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے مرثیے، مثنویاں اور قطعے بھی کہے لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ جرأت نے واسوخت، شہر آشوب اور ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے — یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا
پری سا جو مکھڑا دکھا کر چلے — مجھے تم دِوانہ بنا کر چلے
باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری! — غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

انشاؔ (1817-1752/56): ان کا نام انشاء اللہ خاں تھا۔ وہ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماشاء اللہ خاں کے ساتھ 1779 کے آس پاس لکھنو پہنچے۔ پھر دہلی میں شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انشا بڑے صاحبِ علم و فضل تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ بہت ذہین، بے باک اور حسّاس تھے۔ سولہ سترہ برس دہلی میں گزارنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہاں کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ جرأتؔ و مصحفیؔ کے ساتھ انشا کے معرکے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ انشا نہ صرف دربار کی جان تھے بلکہ ان کا شمار اپنے عہد کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔

انشاؔ نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں انھیں امتیاز حاصل تھا۔ فارسی کلیات کے علاوہ ان کی کتاب 'دریائے لطافت' سے ان کے علم و فضل کا پتا چلتا ہے۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' اور 'سِلکِ گہر' ان کی مختصر داستانیں ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی میں انشا نے یہ اہتمام کیا ہے کہ عربی فارسی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ریختی میں بھی ان کا ایک دیوان موجود ہے۔ طبیعت کے اس رجحان کے باوجود مشکل پسندی، عالمانہ خیال آرائی، سنگلاخ زمینیں اور تراکیب بھی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انھوں نے ہندی کے سبک و شیریں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ!
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھوجائے رنگ ہو میلا

رنگینؔ (1758/63-1834/35) : ان کا نام سعادت یار خاں تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے۔ مگر زیادہ تر وقت لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں گزرا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کے مزاج میں شوخی تھی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

رنگین عیش و عشرت کی زندگی کے دل دادہ تھے۔ 'مجالسِ رنگیں' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے دور کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ 'امتحانِ رنگیں' بھی ان کی معروف کتاب ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور دوسری شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ کہا جاتا ہے شمالی ہند میں ریختی کہنے والے پہلے شاعر رنگینؔ ہیں۔ ریختی میں عورتوں کے خاص محاورے، فقرے اور ان کے روزمرہ کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ رنگین نسوانی زبان کا خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ 'سلطان ٹیپو شہید' کے عنوان سے ان کا ایک قصیدہ بھی مشہور ہے۔ غالب کے معاصر شاہ غمگین گوالیاری، رنگین کے شاگرد تھے۔

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

مجھے چپکے پہنچا دو انشا کے گھر تک
نہ پوچھو کہ کے پیسے ڈولی کہارو

میں ترے صدقے، نہ رکھ اے میری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

شاہ نصیرؔ (1760/61-1838) : شاہ نصیر کا وطن دہلی تھا۔ ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش ہوئی، اس لیے تعلیم ادھوری رہ گئی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائلؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے کئی سفر کیے۔ یہاں آتشؔ و ناسخؔ سے مشاعروں میں معرکہ آرائیاں بھی رہیں۔ وہ یہاں کے مشاعروں پر اثر انداز بھی ہوئے اور ان کے رنگِ سخن سے متاثر بھی۔ آخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہیں

وفات پائی۔

شاہ نصیر کے کلام میں خارجیت، تصنّع اور رعایت لفظی کا عنصر زیادہ ہے۔ انھیں مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ ذوقؔ، مومنؔ اور ظفرؔ ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

تیرہ بختانِ ازل کا کبھی دیکھا نہ فروغ — شب کو جگنو کی طرح اڑ کے نہ جھلکی مکّھی

شیشۂ بادۂ گل رنگ پٹک دے ساقی — جامۂ سبز میں دیکھے جو تنِ سرخ ترا

خیال زلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

دوسرا دور

لکھنؤ میں شاعری کا دوسرا دور ان خصوصیات اور رجحانات سے عبارت ہے جو لکھنوی تہذیب وثقافت کی بنیادی پہچان تصور کیے جاتے ہیں۔ لسانی طرح داری ہو یا تصنع اور صنائع کا زور یا پھر طرز ادا اور فکر وخیال کی نیرنگی، ہر دو سطح پر اس دور میں لکھنؤ کی انفرادیت نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ اس دور کے نمائندہ شعرا میں آتشؔ، ناسخؔ، شوقؔ اور نسیمؔ وغیرہ کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کی شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔

آتشؔ (1768-1847) : ان کا نام خواجہ حیدر علی تھا۔ ان کے والد خواجہ علی بخش دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں بس گئے تھے۔ آتشؔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کم سِنی میں ہی یتیم ہو جانے کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ نواب محمد تقی خاں، ہوسؔ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ انھیں کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں مصحفیؔ کی شاگردی اختیار کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر رشتہ توڑ لیا۔

آتشؔ کے مزاج میں قناعت تھی۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دربار سرکار سے ربط ضبط انھیں پسند نہ تھا۔ مفلسوں اور محتاجوں سے ان کی خوب بنتی تھی۔ ان کی شاعری میں لکھنوی طرز نمایاں ہے۔ انھوں نے صنعتوں سے خوب کام لیا ہے اور جذبات واحساسات کو بھی بڑے سلیقے سے نبھائے ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی مضامین اور مسائلِ تصوّف کے ساتھ ساتھ بلند خیالی اور حسنِ بیان بھی ہے۔ درج ذیل اشعار سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا؟ — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

سن تو سہی! جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟
آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

ناسخ (1772/76-1838) : ان کا نام شیخ امام بخش تھا۔ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں تعلیم وتربیت ہوئی۔ ناسخ زبان داں اور ماہرِ فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ کئی امرا ان کے شاگرد تھے۔ ناسخ نہایت خود دار انسان تھے۔ وہ کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ غازی الدین حیدر نے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب دے کر دربار سے منسلک کرنا چاہا تو ناسخ نے جواب دیا کہ اتنے چھوٹے سے بادشاہ سے خطاب لے کر کیا کروں گا۔ غازی الدین حیدر کو غیر متوقع جواب دینے کے بعد ناسخ بادشاہ کے عتاب کے خوف سے لکھنؤ چھوڑ کر کچھ دِنوں کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ نظامِ دکن کے دیوان مہاراجا چندولال نے ناسخ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے وہاں جانا بھی گوارا نہ کیا۔

ناسخ شاعری کے معنوی حسن سے زیادہ ظاہری حسن کے دلدادہ تھے۔ اس لحاظ سے اردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے تین دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔

زندگی زندہ دِلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

شوقؔ (1782-1871) : ان کا نام تصدّق حسین خاں اور نواب مرزا عرفیت تھی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم طِب پر بھی انھوں نے مکمل دسترس بہم پہنچائی اور طبابت کو بہ طور پیشہ اختیار کیا۔ واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں وہ شاہی معالج بھی مقرر ہوئے۔

شعروسخن سے دلچسپی کے باعث شوق شاعری کی طرف راغب ہوئے اور آتش کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن انھیں شہرت مثنوی نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ ان کی مثنویاں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کافی مقبول ہوئیں۔ ان تینوں مثنویوں میں 'زہرِ عشق' نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔

زہرِ عشق کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے۔ واقعات و کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور انھیں سیدھے سادے انداز میں روزمرّہ کی بول چال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے بڑے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ قصّہ اتنے دلچسپ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ کرداروں کے جذبات بڑے کامیاب اور مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان امتیازات کے علاوہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کی سچّی تصویرکشی بھی اس مثنوی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ 'زہرِ عشق' کے چند اشعار دیکھیے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے
عشق میں ہم نے یہ کمائی کی   دل دیا، غم سے آشنائی کی
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں   ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

نسیم (1811-1845) : ان کا نام پنڈت دیا شنکر تھا۔ وہ گنگا پرشاد کول کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بیس برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ آتش کی شاگردی اختیار کی تھی۔ نسیم نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ چند مخمس اور ترجیع بند بھی ہیں، لیکن ان کی ساری شہرت ان کی مثنوی 'گلزارِ نسیم' سے ہے۔

نسیم کی غزلوں میں ان کے استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور خودداری ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کی زبان پر لکھنوی رنگ غالب ہے۔ رعایتِ لفظی اور صنائع کے استعمال کے باوجود معنویت اور پاکیزگی کا خیال رکھنا ان کا خاص وصف ہے۔ کلام میں برجستگی اور اختصار سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔

مثنوی 'گلزارِ نسیم' 1838/39 میں لکھی گئی اور 1844 میں شائع ہوئی۔ اس میں جو کہانی بیان ہوئی ہے، وہ 'قصّۂ گلِ بکاولی' کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ داستان میں غزل کے اشعار جیسا ایجاز پیدا ہو گیا ہے۔ 'گلزارِ نسیم' میں تشبیہ و استعارہ کی کثرت، لفظی و معنوی رعایات اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کے ہنر نے ایسا جادو جگایا کہ چھوٹی سی کہانی میں مختلف معنوی امکانات پیدا ہو گئے۔ یہ خوبی غزل کے عمدہ شعر میں ہوتی ہے۔

مثنوی 'گلزارِنسیم' کو دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا مثالی نمونہ کہا جاتا ہے۔ نسیم کے زمانے کے لکھنؤ اور وہاں کی شاعری میں جو شائستگی، مرصّع کاری اور تکلفات رائج تھے، وہ اس مثنوی میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

گُل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بُلبُلِ خامہ نعرہ زن ہے
گل چیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کِھل کِھلایا
وہ سبزۂ باغِ خواب آرام — یعنی وہ بکاوَلی گل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غُل سے — اُٹھّی نکہت سی فرشِ گل سے
منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا، تو وہ گل ہَوا ہُوا ہے — کچھ اور ہی گل کِھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کِدھر گیا گل! — جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون! — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون!
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے
نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل؟ — سَوسن! تو بتا کدھر گیا گل؟
سنبل! مرا تازیانہ لانا — شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا

تیسرا دور

اردو میں مرثیہ گوئی کی روایت :

دبستانِ لکھنؤ کے تیسرے دور کی شاعری کا امتیازی وصف مرثیہ نگاری ہے۔ اس دور میں مرثیہ نگاری نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ مرثیہ نگاروں کے حوالے سے جن شعرا کو بقائے دوام حاصل ہوئی ان میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے نام سب سے زیادہ اہم ہیں۔

اردو مرثیے کی شروعات دکن سے ہوئی۔ شمالی ہند میں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ نے اس میں کامیاب تجربے کر کے اس صنف کو اور ترقی دی۔

میر مستحسن خلیقؔ، میر مظفر حسین ضمیرؔ اور مرزا جعفر علی فصیحؔ نے مرثیے کو ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کرائیں۔ بالخصوص مرثیے کے مختلف اجزائے ترکیبی میں تمہید، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کا تعین میر ضمیر ہی سے منسوب ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ لکھنؤ میں اس صنف نے شاعری میں توازن پیدا کیا اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کی۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے عہد میں یہ صنف اپنے درجۂ کمال کو پہنچی اور بعد میں آنے والے مرثیہ گویوں نے اسی طرز اور ترتیب کی پیروی کی۔

میر انیسؔ (1874-1802/03): ان کا نام میر ببر علی تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ میر حسنؔ کے پوتے تھے۔ میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ بھی ایک باکمال شاعر تھے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔

میر انیسؔ نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ ان کے مرثیے فصاحت و بلاغت کی عمدہ مثال ہیں۔ میر انیس کو منظر نگاری، کردار نگاری اور رزم نگاری میں کمال حاصل تھا۔ واقعات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے نادر تشبیہیں، دلکش استعارے، آسان زبان اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ میر انیسؔ کی زبان عام فہم ہونے کے باوجود شگفتہ اور دل کش ہے۔

میر انیس نے مرثیے کے علاوہ غزلیں، رباعیاں اور سلام بھی کہے ہیں۔ اُن کے مراثی پانچ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زبان و بیان کی مختلف خصوصیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی ترجمانی اور مقامی تہذیب کی عکاسی نے ان مرثیوں کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں وہ سحر   دم بہ دم جھومتے تھے، وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرّد پہ بچھائے تھے گُہر   لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جا بہ جا، وہ گُہر ہائے آب دار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے، شاخوں کا بار بار   بالائے نخل ایک جو بُلبُل، تو گُل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے، کٹورے گُلاب کے

مرزا دبیر (1803-1875) : ان کا نام مرزا سلامت علی تھا۔ دبیؔر کے اجداد ایران سے آئے تھے۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ وہیں کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی، فارسی کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔

مرزا دبیر کو شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ لکھنؤ کے ماحول نے اس شوق کو تیز تر کر دیا۔ وہ میر ضمیؔر کے شاگرد تھے۔ لطیف تشبیہوں، دلآویز استعاروں اور صنائع بدائع کی فراوانی نے مرزا دبیؔر کے کلام کو ایک انفرادیت بخشی۔ مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کے مراثی میں فضائل اور رزم کے حصّے پُر شکوہ اور ماتم اور بین کے حصّے اثر انگیز ہیں۔

مرزا دبیؔر نے رباعی، قطعہ، مثنوی، سلام اور قصیدے بھی کہے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ 'احسن القصص' اور 'معراج نامہ' ان کی دو مثنویاں ہیں۔ ان کا کلام 'دفترِ ماتم' کے نام سے بیس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں:

کس شیر کی آمد ہے، کہ رَن کانپ رہا ہے　　رُستم کا جگر، زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے　　سب ایک طرف، چرخِ کُہن کانپ رہا ہے
شمیر بکف دیکھ کے، حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں، سمیٹے ہوئے پَر کو

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی　　پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اَور قطع زلفِ لیلیِ زُہرہ لقب ہوئی　　مجنُوں صفتِ قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا، پیوند کے لیے

انیسؔ و دبیؔر کے بعد نفیسؔ، تعشّقؔ اور رشیؔد نے بھی مرثیے لکھے، مگر وہ ان دونوں کے برابر نہ پہنچ سکے۔ حاؔلی اور ان کے بعض معاصرین نے عام ڈگر سے ہٹ کر شخصی مرثیہ نگاری کی داغ بیل ڈالی جسے رفتہ رفتہ خاصا فروغ حاصل ہوا۔ مرثیے کے علاوہ سلام نگاری میں بھی اسی دور میں ایک نیا تجربہ کیا گیا، چنانچہ اہلِ بیتؓ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو مخاطب کرتے ہوئے سلام لکھے گئے۔